کچھ انتظار حسین کے بارے میں

—— مرزا حامد بیگ

انتظار حسین، محض گلی کوچے، کنکری، آخری آدمی، شہرِافسوس، کچھوے اور خیمے سے دُور...... چھ افسانوی مجموعوں، متعدد تنقیدی مضامین، ڈراموں...... چاند گہن، دن اور داستان، بستی اور آگے سمندر ہے جیسے چھوٹے بڑے ناولوں، سفرناموں، سینکڑوں اردو، انگریزی کالموں...... ایوان تورگنیف، جان ڈیوی، تھارنٹن وائلڈر اور سٹیورٹ شریم کے مترجم کا نام نہیں۔ انتظار حسین تو ہمارے عہد کی ایک اہم تہذیبی شخصیت ہے۔

ادب کی رائٹ ونگ کیلئے ناقابل قبول۔ ترقی پسندوں کی نظر میں ایک ایسا رجعت پسند، جس کی لبرل اپروچ خود ترقی پسندوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ انور سجاد ہی کی مثال لیجئے، جنھوں نے آخرکار مولانا طاہر القادری کی بیعت کر لی۔ انتظار حسین...... سن سینتالیس کا ایک ایسا لٹا پٹا نووارد، جس نے زیست کرنے کو پنجاب کا سب سے مشکل شہر چنا...... لاہور، جو بقول حضرت علی ہجویری، ''قطب الارشاد'' ہے۔ بے شک جس نے لاہور فتح کر لیا، اس کا ڈنکا پورے برصغیر میں بجا☆۔ ترقی پسند تحریک کی موجِ بلا خیز کا منکر...... مقبولِ عام رومان پسندی سے منحرف...... ہر دھڑے کے ناقدانہ گٹھ جوڑ سے باہر...... داد و تحسین سے بے پروا، انتظار حسین۔

اس جگن ناتھ کے رتھ کو کھینچنے کیلئے بلراج مین را اور انور سجاد جیسے دوتن ومند سرخ بیل نہ بھی میسر آتے تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑنا تھا۔ اس لیے کہ انتظار حسین کے رد میں بیک وقت اسلامی ادب کے نظریہ سازوں اور نو ترقی پسندوں کے لگائے ہوئے بے محابہ زور کے علاوہ میرے ساتھیوں یعنی ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں اور ہمارے بعد آنے والوں کے مضامین لکھے تو گئے ردِ کفر کے طور پر، لیکن اس سے انتظار حسین کی طاقت گھٹی نہیں، بڑھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف انتظار حسین کا Selective ہونا اور تسلسل کے ساتھ آنکھیں ٹکا کر کام کرنا ہے۔

میرے نزدیک انتظار حسین کا سب سے موقر حوالہ شارٹ فکشن ہے، اور آج مجھے اسی حوالے سے بات کرنا ہے۔ سوچتا ہوں بات کہاں سے شروع کی جائے۔ انتظار حسین کے اولین افسانے ''قیوما کی دکان'' مطبوعہ ''ادب لطیف'' لاہور دسمبر ۱۹۴۸ء سے یا انتظار حسین کے قریبی معاصرین خورخے لوئس بورخیس، قرۃ العین حیدر اور گبریل گارشیا مارکیز کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہونے سے۔ کیوں نا پیچھے مڑ کر انتظار حسین کے ان Foot Prints کو دیکھا جائے، جن کے گرد عقیدت اور محبت کا وہ نورانی ہالہ دکھائی نہیں دیتا، جو آج انتظار حسین کے نام کے گرد کھنچتا چلا جا رہا ہے۔

کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ہر دور میں ہر بڑے انسانی جدل نے نہ صرف عالمی ادب کو بڑے

بڑے شاہکار دیئے، بلکہ بڑے لکھنے والے بھی دیئے۔ ہمارے ہاں سن سینتالیس کے فسادات سے متعلق دو طرح کے شاہکار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ، جن میں بورژس پیستر ناک، کے ڈاکٹر ژواگو کی طرح فرد بھیانک جدل میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا کوئی عمل اپنا نہیں۔ حالات کا ریلا اسے جہاں چاہے گھسیٹ لے جائے، جیسے منٹو کا ''ٹھنڈا گوشت''، احمد ندیم قاسمی کا ''پرمیشر سنگھ'' اور حیات اللہ انصاری کا ''شکر گزار آنکھیں''...... یا پھر، جدل کے متاثرہ افراد کے ایسے افسانے، جن کے کردار اپنے اپنے طور پر سچے ہیں، لیکن وقت اور حالات نے جنہیں جھوٹا ثابت کر دیا۔ جیسے منٹو کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور راجندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی'' لیکن اردو ادب اس اعتبار سے خوش نصیب رہا کہ سن سینتالیس کی کوکھ سے ہمیں ایک پورا افسانہ نگار مل گیا...... انتظار حسین۔

انتظار حسین کو ''ذہنی جلاوطن'' کہا گیا۔ ایک ایسا جلاوطن، جو اُس ''میں'' کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہے، جو تہذیبی بحران میں ماضی کی کسی اندھی گلی میں کھویا گیا۔ انتظار حسین کے ہاں کھوئے ہوئے ماضی کی یہ کرید ''گلی کوچے'' کے افسانوں خصوصاً ''قیوما کی دکان''، ''اجودھیا''، ''عقیلہ خالہ'' اور ''ایک بن لکھی رزمیہ'' میں بہت نمایاں ہے۔ ''گلی کوچے'' (طبع اول ۱۹۵۲) کا آغاز صیبوں کے اجڑنے کے ماتم سے ہوتا ہے اور ''کنکری'' (طبع اول ۱۹۵۵) کے بیشتر افسانوی کردار سوگوار حالت میں ہیں۔ ۱۹۶۰ء تک آتے آتے انتظار حسین نے ہجرت کے حوالے سے پیدا ہونے والی Tension کے مقابل انسان کی بے حرمتی اور بے توقیری کو اہمیت دی۔ یوں ''آخری آدمی'' (۱۹۶۷) میں شامل چار افسانوں یعنی ''آخری آدمی''، ''زرد کتا''، ''کایا کلپ'' اور ''ٹانگیں'' لکھ کر انتظار حسین نے جہاں تکنیکی تنوع کا مظاہرہ کیا، وہیں موضوع اور فکری سطح پر بھی بڑی بڑی زقندیں بھریں۔ یوں ''آخری آدمی'' کے افسانے انتظار حسین کے یونیک جینئیس کا اعلان ہیں۔ لیکن یہاں تک آتے آتے انتظار حسین کو کیا کچھ نہیں سننا پڑا۔ ترقی پسندوں نے اسے نانی اماں کی سنائی ہوئی کہانیوں کو دہرانے والا رجعت پسند افسانہ نگار کہا اور جدید افسانہ نگاروں نے ماضی کا اسیر بتایا۔ اس کے جواب میں انتظار حسین نے صرف اتنا کہا کہ:

> ''یہ جو چھوٹی سی اذیت اس فقیر کے نصیب میں لکھی گئی ہے، وہ تمہیں عطا نہیں ہوئی۔ یعنی مین را کو، نہ سریندر پرکاش کو، نہ اپنے پاکستان کے انور سجاد کو...... میں اپنی مصیبت میں زمینوں اور زمانوں میں آوارہ پھرتا ہوں۔ کتنے دنوں اجودھیا اور کربلا کے بیچ مارا مارا پھرتا رہا۔ یہ جاننے کیلئے کہ جب بھلے آدمی اپنی بستی کو چھوڑتے ہیں تو ان پر کیا بیتتی ہے اور خود بستی پر کیا بیتتی ہے''۔ (ابتدائیہ: کچھوے، طبع اول ۱۹۸۱ء)

کچھ یہی سبب ہے کہ جب برصغیر کے مسلمانوں کو زوال ڈھاکہ کے ساتھ دوسری بار ہجرت کا سامنا کرنا پڑا تو انتظار حسین نے اسی تسلسل میں اپنے کئی پرانے افسانوں کو نئے افسانوں کے ساتھ ملا کر ''شہر افسوس'' (طبع اول ۱۹۷۲) میں یکجا کرتے ہوئے نئے معانی سے دو چار کر دیا۔ بھلا اب اسے کوئی کیا نام دے؟ یہ ماضی پرستی تو نہ ہوئی۔ البتہ انتظار حسین کے چند افسانے قدیم طرز احساس سے

عاری لوگوں کیلئے وہ اہمیت نہیں رکھتے، جس توجہ کے وہ طالب ہیں۔ بھلے افسانہ "کچھوے" انتظار حسین کو صدائے بازگشت کا اسیر کہلوائے لیکن "بادل" میں تصوف کے رچاؤ اور اجتماعی لاشعور کو ساتھ لے کر مستقبل کی جانب اشارے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی لیے میرے خیال میں انتظار حسین کے بارے میں انیس ناگی یا سعادت سعید جیسے سوئے ہوئے ناقدین کا بیان معتبر نہیں ٹھہرتا۔

محمود ہاشمی نے انتظار حسین کے ناسٹلجیا کو تاریخ کے دھارے سے کٹ جانے کا جتن کہا ہے لیکن دیکھیے کچھ لاجیکل چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جن سے کٹنے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بچا نہیں جا سکتا۔ ہمیں پیچھے کی طرف لوٹ کر جانا پڑتا ہے اور انتظار حسین تو گھر کی چیزوں کو بھی رکھے رکھے جڑیں پکڑتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، پھر آخر ایسا کیوں نہ ہو۔ انتظار حسین نے بہت پہلے سوال اٹھایا تھا، اور بار بار یہی سوال دوہرایا کیے کہ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ اور اس سرزمین کے ساتھ ہمارا رشتہ کیسا؟ ☆☆ شاید اس لیے کہ انتظار حسین نے اپنے ماضی اور حال میں وجہ امتیاز یا وجہ اختلاف ڈھونڈنے کی بجائے اس خطے کی پوری تاریخ کو ہمیشہ حاضر و ناظر جانا۔

بے شک ہم ماضی اور حال میں فرق کر کے اپنے حافظے سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس نوع کی محرومی انتظار حسین کو گوارا نہیں۔ واقعہ کربلا ہو یا سن سینتالیس، یہ وقوع لوگوں کیلئے ماضی ہوں تو ہوں، انتظار حسین کے لیے ہمیشہ سے حاضر ناظر ہیں۔ اجتماعی حافظے کی یہ Preservation انتظار حسین کا وصفِ خاص ہے۔ یہ مانا کہ اس صدی کے اختتام پر ہمارے ماضی اور حال کے حوالے سے انتظار حسین کے اٹھائے ہوئے سوالات اور تعصبات سے کہیں زیادہ اہم سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں ☆☆☆ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انتظار حسین کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات دینے کا حوصلہ تا حال ہم میں پیدا نہیں ہوا۔ پھر انتظار حسین کو "ماضی کا اسیر" کہنے کا حوصلہ کون پیدا کرے، جس نے ہر دور میں موجود صورت حالات کا تجزیہ کرنے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ خاص طور پر افسانہ "دوسرا راستہ" میں معاشرتی حوالہ جات سے متعلق اٹھائے گئے سوالات سیاسی تجزیہ نگاروں کے سپرد کر دیئے جائیں تو کون ایسا جی دار ہوگا جو ہمیں شافی جوابات سے نوازے؟ اس لیے کہ معاشرتی حوالوں کے ساتھ قومی تشخص سے متعلق سوال بڑا تہہ دار ہے۔

اسی طرح افسانہ "آخری آدمی" کی بنیاد تو اہلِ یہود سے متعلق وہ روایت ہے کہ سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا گیا، لیکن یہ افسانہ طمع کے خلاف ایک قدیمی صداقت کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ سن اٹھاون کے مارشل لاء کے پیدا کردہ خوف و ہراس کا عکاس بھی ہے۔ یہی صورت تصوف کے حوالے سے لکھے گئے افسانہ "زرد کتا" کی ہے۔ "کایا کلپ" تو اس حوالے سے اور بھی نمایاں ہے۔ یعنی اتنا ظلم نہیں ہوتا جتنا کہ اس کی تشہیر کی جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں انجانا خوف لوگوں کے اذہان کو اپنے شکنجے میں کستا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان اپنے اعلیٰ رتبے سے رفتہ رفتہ محروم ہو کر ایک ادنیٰ اور حقیر مخلوق میں ڈھلنے لگتا ہے۔

ایوب خانی دور میں بعض موضوعات پر براہ راست بیانیہ میں لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا انتظار حسین نے اسلوب، تکنیک اور وژن کی سطح پر ایک بڑی کروٹ لی۔ کہیں تو آسمانی صحائف کو بنیاد بنایا اور کہیں صوفیاء سے متعلق حکایات اور روایات کو۔ کہیں تمثیلی انداز اختیار کیا اور کہیں علامتی اور تجریدی۔ تکنیکی سطح پر اس تنوع کے ساتھ ساتھ انتظار حسین نے فکشن کی مشرقی روایت کو چھانا پھٹکا اور یوں ہمیں اساطیر اور داستانوی پیرایہ اظہار میں نئے سرے سے ایک نیا پن دیکھنے کو ملا۔ ''آخری آدمی'' میں شامل افسانے وجودیت کے حوالے سے بھی زیر بحث لائے جا سکتے ہیں اور انتظار حسین کی وجودیت، البیر کامیو کی وجودیت سے جداگانہ ہے۔ محض اس لیے کہ مغرب کے مقابلے میں ہماری نفسی کیفیتیں مختلف ہیں اور معاشرتی دباؤ مختلف۔

افسانوی مجموعہ ''شہر افسوس'' میں دوسری ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کے دکھ کو جس طرح انتظار حسین نے محسوس کیا اور کروایا، اس کی مثال کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یوں ''شہر افسوس'' کے افسانوں کو اگر مشرقی پاکستان کے افسانہ نگاروں خصوصاً غلام محمد، ام عمارہ، زین العابدین، محمود واجد اور شہزاد منظر کے زوالِ ڈھاکہ سے متعلق افسانوں کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے یہ سارے کے سارے افسانے جناح ایونیو میں بیٹھ کر لکھے گئے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ قومی سطح پر ہماری بے خبری اور بے دردی نے اس المیہ کو پیچیدہ تر بنا دیا اور اس کا نتیجہ زوال ڈھاکہ (۱۹۷۱) کی صورت نکلا۔

انتظار حسین کی ماضی قریب میں چلت پھرت، ڈھونڈ اور بھٹک کا آغاز ''گلی کوچے'' سے ہوا تھا جو افسانوی مجموعے ''کنکری'' تک آ کر رک سا گیا۔ یوں انتظار حسین نے ''آخری آدمی'' کے افسانے مکمل کیے، لیکن زوال ڈھاکہ ۱۹۷۱ء ایک ایسا سانحہ تھا جسے قلمبند کرتے ہوئے جب انتظار حسین نے ''اندھی گلی'' اور ''وہ جو کھوئے گئے'' جیسے افسانے لکھے تو زوال ڈھاکہ کے سوتے سن سینتالیس کے کرب ناک فسادات کے ہنگام اور انسان کے بے توقیر ہونے کے معاملات میں جا پھوٹے اور انتظار حسین بجائے حال پر رکنے یا مستقبل کی طرف بڑھنے کے ماضی بعید میں چلے گئے۔ پانچویں اور چھٹے افسانوی مجموعوں ''کچھوے'' (طبع اول ۱۹۸۱) اور ''خیمے سے دور'' (طبع اول ۱۹۸۶) میں شامل دو اہم افسانے ''کچھوے'' اور ''واپس'' ہمارے قدیم ماضی اور اجتماعی لاشعور کے افسانے ہیں جبکہ افسانہ ''بادل'' میں تصوف کے رچاؤ کے ساتھ مستقبل کی جانب اشارے خصوصی معنویت کے حامل۔ یوں انتظار حسین نے مہاتما بدھ کے قدیم دور تک پیچھے ہٹ کر اس خطے میں آباد لوگوں کی خفتہ نفسیات اور تاریخ کے بہت پھیلے ہوئے منظر نامے کو گہرائی میں جا کر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ خصوصاً تین افسانوں، ''واپس''، ''کچھوے'' اور ''پتے'' کی سپلائی لائن بدھ دور کی جاتک کہانیوں سے جڑی ہوئی ہے۔ جب کہ افسانہ ''کشتی'' میں قصص الانبیاء، عہد نامۂ قدیم، وید مقدس اور قرآن مجید کے اجزا باہم ایک ہو کر کچھ اس رچاؤ کے ساتھ سامنے آئے کہ اس رفت گزشت قدیم عہد میں ہماری موجودہ سیاست کی جملہ مکروہات اور

تہذیبی الجھاوے جھلک دکھانے لگے۔ خود انتظار حسین نے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے "نئے افسانہ نگار کے نام" چند سطور لکھیں۔

"آوارہ پھرتے پھراتے، میں مہاتما بدھ کی جاتکوں میں جا نکلا اور ششدر رہ گیا...... یا میرے مولا، یہ کون سی دنیائے واردات ہے جہاں آدمی ان گنت زمانوں میں اور ان گنت قالبوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ بے کراں وقت میں، رنگا رنگ پیکروں میں پھیلی ہوئی بے کراں انسانی ذات...... اللہ اگر توفیق دے تو جاتکوں سے یہ شعور پا کر آج کے آدمی کے کرب کو سمجھا تو جا سکتا ہے"۔ (دیباچہ" کچھوے" سے اقتباس)

اور میں نے یہ سطور پڑھ کر سوچا تھا، بے شک...... اگر اللہ توفیق دے تو۔

☆ مرزا صاحب! ادبی تناظر میں یہ تصور فرسودہ اور الٹ ہو چکا ہے۔ یہ قول اب یوں ہونا چاہیے" بے شک جولاہور سے بچ نکلا، اس کا ڈنکا پورے برصغیر میں بجا۔" ادبی لحاظ سے لاہور کی مثال اب ایک بہت بڑے تالاب یعنی ٹھہرے ہوئے (Stagnant) پانی کی سی ہے۔ (ن۔ا۔ن)

☆☆ حیرت ہے کہ انتظار حسین گھر کی چیزوں کو تو جڑیں پکڑتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن جس سرزمین پر رہتے، اور جس کے ثمرات و فیوض اٹھاتے ہوئے انہیں نصف صدی کا عرصہ ہو گیا ہے اس سرزمین کے ساتھ ابھی تک ان کا کوئی رشتہ استوار نہیں ہو سکا! تہذیبی و ثقافتی تعامل (Interaction) اور "اجتماعی حافظے" کا یہ کون سا دانشورانہ پہلو ہے؟ (ن۔ا۔ن)

☆☆☆ اس پورے مضمون میں یہی ایک بات قابلِ توجہ ہے، اور آپ نے بالکل درست لکھا ہے کہ "صدی کے اختتام پر ماضی اور حال کے حوالے سے انتظار حسین کے اٹھائے ہوئے سوالات اور تعصبات سے کہیں زیادہ اہم سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں۔" درحقیقت انتظار صاحب کے، ایک مخصوص تناظر میں، اٹھائے ہوئے سوالات اب کلیشے بن چکے ہیں۔ نئے معاشرتی، علاقائی اور بین الاقوامی تناظرات ان سوالات سے کہیں آگے، نئے، مختلف فیہ اور کثیر الجہت مباحث کے متقاضی ہیں۔ (ن۔ا۔ن)

زندگی اور موت کے درمیان

خواہش!!
جینے مرنے کی
آنکھیں!!
پتھر کرنے کی
دریا!!
پار اترنے کی!!

سوال

آنکھ میں چراغ کی
اک عجب سوال تھا
کس نے، کیوں جلا دیا؟
کس نے، پھر بجھا دیا؟

سرفراز تبسم

شمارہ- ۱۵، ۱۶، اکتوبر ۲۰۰۰ تا مارچ ۲۰۰۱ء

مدیر: نصیر احمد ناصر

قیمت موجودہ شمارہ: ۱۵۰ روپے
زر سالانہ: پاکستان: ۳۰۰ روپے
امریکہ اور کینیڈا کیلئے: ۲۵۰۰ روپے
دیگر ممالک کے لئے: ۱۵۰۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۱۷- ڈی، سیکٹر بی-۲
میرپور (اے۔کے)
پوسٹ کوڈ ۱۰۲۵۰، پاکستان

۲۵/ اے، شادمان کالونی-۱، جیل روڈ، لاہور

سہ ماہی

تسطیر

لاہور